ACADEMIA International Journal for Social Sciences
Volume 4, Issue 3, 2025 ISSN-L (Online): 3006-6638

رشید امجد کا علامتی اسلوب: ”ست رنگے پرندے کے تعاقب میں“ کے منتخب افسانوں کے تناظر میں ایک مطالعہ

The Allegorical Style of Rasheed Amjad: A study of selective short stories from “Set Range Parindey Ke Ta’aqub Main”

Mahnoor Shabir
mahnoorshabbir585@gmail.com
BS Urdu Research Scholar, Kinnard College for Women, Lahore
Dr. Elizabeth Shad
elizabethshad@gmail.com
Associate Professor, Department of Urdu, Kinnard College for Women, Lahore
Corresponding Author: *Dr. Elizabeth Shad elizabethshad@gmail.com

Received: 23-06-2025 **Revised:** 30-07-2025 **Accepted:** 08-08-2025 **Published:** 18-08-2025

ABSTRACT
Dr. Rasheed Amjad (1940–2021) was a seminal figure in modern Urdu literature, celebrated for his mastery of symbolic storytelling and his profound influence on the evolution of the Urdu short story (afsana). Rasheed Amjad began writing short stories after 1960 and soon entered the literary mainstream. Initially, he portrayed real life in his works but later gained recognition as a symbolic writer. Alongside his work in teaching, research, and criticism, he continued to write short stories. Rasheed Amjad has authored eleven collections of short stories. This research article focuses on analyzing his collection of short stories titled "Set Range Prindey Ke Ta'aqub Mein," where even silence speaks and every empty space holds a profound message.

Keywords: *Allegorical Style, Rasheed Amjad, Short Stories, Set Range Parindey Ke Ta’aqub Main*

رشید امجد اردو ادب کے مایہ ناز افسانہ نگار، نقاد، دانشور اور اسکالر ہیں۔ انھوں نے اُردو افسانے کو جدید فکری رجحانات سے روشناس کروایا۔ انھوں نے روایت کے ٹوٹتے ہوئے بندھنوں اور جدید افسانے کی ابتداء کو نہایت قریب سے دیکھا۔ انھوں نے علامت اور تجریدیت کو نہ صرف اپنایا بلکہ اس میں انفرادیت پیدا کی۔ رشید امجد کا افسانوی مجموعہ ”ست رنگے پرندے کے تعاقب میں“ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا جو پچیس افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں رشید امجد نے زندگی کی حقیقتوں، انسانی احساسات، تنہائی، معاشرتی مسائل اور جدید دنیا کے پیچیدہ تجربات کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ تکنیکی حوالے سے ان کے افسانے تجریدی اور علامتی ہیں۔ واقعہ کی بجائے خیال کے گرد کہانی کا تانا بانا تیار ہوتا ہے اور خیال کی مضبوط گرفت ہی افسانے کا پلاٹ مرتب کرتی ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار میں جو جھلک نظر آتی ہے، وہ بہت عمدہ ہوتی ہے اور اس سے انسان کو اپنی زندگی میں تقویت ملتی ہے۔

اس افسانوی مجموعے میں سب سے پہلا افسانہ ” وقت اندھا نہیں ہوتا“ کے عنوان سے ہے۔ یہ افسانہ وقت، محبت، ماضی کی یادوں اور انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں پر مبنی ہے۔ کہانی کا بنیادی نقطہ یہی ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے مگر وقت اندھا نہیں ہوتا۔ وقت کی تبدیلیاں انسانوں کی زندگیوں کو متاثر کرتی ہیں۔ انھیں بدل دیتی ہیں اور ان کے خوابوں اور محبتوں پر اپنی چھاپ چھوڑ دیتی ہیں۔ رشید امجد کے ہاں علامتی، اشاراتی انداز پایا جاتا ہے۔ وقت کی حقیقت کرداروں کے علاوہ علامت کے ذریعے پیش کی گئی ہے۔ مرکزی کردار ایک نوجوان ہے جو پختہ عمر کی خاتون سے محبت کرتا ہے۔ ابتدا میں لڑکی کو ایک دل لکش، پرکشش، خوبصورت شخصیت کے طور پر دکھایا گیا ہے جو اپنے شوق، خیالات اور زندگی کے بارے میں جوش و خروش رکھتی ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کے وجود پر جھریاں، تھکن اور ویرانی چھا جاتی ہے۔ نوجوان کی محبت شدید ہے مگر وہ اپنے جذبات لڑکی کو بتا نہیں پاتا۔ ہر وقت بے چین رہتا ہے پھر اپنے جذبات عیاں کرنے کے بعد بھی اپنی جھجک مٹا نہیں پاتا۔ جس کے سبب وہ آپ سے تم تک کا سفر طے نہیں کر پاتا اور بے نام سی جھجک کا شکار رہتا ہے۔ نوجوان لڑکی کے لمس کو پہلی دفعہ جب محسوس کرتا ہے تو اس کے بدن میں کرنٹ سا دوڑ جاتا ہے اور پھر یہ چلتا ہے کہ کبھی پلیٹ پکڑاتے وقت یا چائے کی پیالی پکڑاتے وقت انگلیاں ہاتھ سے مس ہوئیں، اتنا سا وقت نوجوان لمس کو محسوس کرتا ہے۔ خوابوں میں وہ لڑکی کو اپنے قریب خیال کرتا ہے مگر حقیقت میں اسی فاصلے پر ہوتا ہے جہاں وہ پہلے تھا۔ ایک دن بے چینی اور بے یقینی کے سبب وہ لڑکی سے شادی کی خواہش کرتا ہے۔ لڑکی کافی دیر کے لیے چپ رہتی ہے پھر دھیمی آواز میں کہتی ہے کہ:

"تمہیں اپنی میری عمروں کا فرق معلوم ہے۔"[۱]

نوجوان اس بات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ لڑکی یہ بھی کہتی ہے کہ:

"محبت اندھی ہوتی ہے، وقت اندھا نہیں ہوتا۔"[۲]

کیونکہ وہ جانتی ہے کہ عمر کا فرق، زندگی کے حقائق اور وقت کی حقیقتیں اس محبت کو ممکن نہیں رہنے دیں گی۔ جب نوجوان جانے لگتا ہے تو اس کے ماتھے پر بوسہ دیتی ہے تو یہ لمس وہ ہر وقت یہاں تک کہ امتحان کے وقت بھی محسوس کرتا ہے۔ برسوں بعد جب نوجوان کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ محبت، وہ کشش، وہ خوبصورتی محسوس نہیں کر پاتا۔ ایسے لگتا ہے کہ وقت کی تلخ حقیقت دیکھ کے اس کے جذبات ماند یا سرد پڑ گئے ہیں جو دانت پہلے اس کو چمکتے دکھائی دیتے تھے، اب بدھے معلوم ہوتے ہیں اور گھن آتی ہے۔ وہ اب کوئی لمس محسوس نہیں کر پاتا۔ جاتے وقت لڑکی جو عورت بن چکی ہوتی ہے نوجوان کے ماتھے پر ہونٹ رکھتی ہے اور اندر چلی جاتی ہے۔ نوجوان اس لمس کو محسوس نہیں کر پاتا اور جاتے وقت وہ یہی سوچتا ہے کہ:

"کیا واقعی وقت اندھا نہیں ہوتا؟"[۳]

یہاں پر ایک پہلو لڑکی کی محبت کا نظر آتا ہے مگر وہ اپنی محبت کو خاموشی کے پردے میں چھپا لیتی ہے۔ وہ اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ وقت کبھی نہیں رکتا۔ وقت کا کام ہے چلنا اور وہ چلتا ہی رہتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز بدل جاتی ہے۔ اس کی جوانی پر بھی بڑھاپے کا رنگ غالب آئے گا اور پھر وہ خوبصورتی اور کشش باقی نہیں رہے گی۔

اس کہانی کا راوی ہی وہ نوجوان ہے جو وقت کی بے رحم تلخیوں کی لپیٹ میں ہے۔ انسان کچھ چیزوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ اس وقت صرف اپنی مطلوبہ چیز کو پانا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ حقیقت سے منہ موڑ لیتا ہے لیکن یہ کچھ عرصے تک رہتا ہے کیونکہ وقت کا کام تو ہے چلنا، وہ تو گزرتا ہی ہے۔ کسی کے لیے نہیں ٹھہرتا لیکن اپنا اثر ضرور چھوڑتا ہے۔ انسان کی زندگی میں گہرے اثرات چھوڑ دیتا ہے اور خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں لے آتا ہے اور جو چیز وہ پہلے نظر انداز کر دیتا ہے وہ حقیقت بن کر سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ انسان ہکا بکا ہو جاتا ہے اور اس کے پاس الفاظ ختم ہو جاتے ہیں۔

اس کہانی میں رشید امجد نے وقت کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کے ذریعے ماضی کی یادیں اور تلخ حقیقتوں سے بھی ہمیں روشناس کرایا ہے۔ وقت زندگی کی حقیقت ہے۔ ہماری زندگی کا انحصار ہی وقت پر ہے۔ وقت سے ہی زندگی ڈسپلن سے گزرتی ہے۔ جو وقت کی قدر نہیں کرتے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے، وہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ چاہے کوئی بھی چیز ہو، چاہے وہ زندگی کی دوڑ دھوپ ہو، محبت ہو۔ اسی لیے ہمیں وقت کی قدر کرنی چاہیے اور حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہم کتنے ہی حقیقت سے چھپ جائیں، اسے نظر انداز کر دیں، وقت کا بے رحم پہیہ گھوم کر سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

افسانہ "ست رنگے پرندے کے تعاقب میں" پرانی ثقافت اور روایت سے جڑی محبت کو اجاگر کرتا ہے۔ مرکزی کردار اور اس کے بیوی بچے پہلے محلے والے گھر میں رہتے تھے۔ نیا گھر لینے کی صورت میں بہت سا پرانا سامان بیچ دیا جاتا ہے مگر ایک چارپائی رہ جاتی ہے جو اس افسانے میں سب سے بڑی علامت ہے۔ نئے گھر میں شفٹ ہونے کے بعد بیوی بچوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ چارپائی کو کباڑی والے کو بیچ دیں گے مگر گھر کے سربراہ کہانی کے مرکزی کردار کا خیال ہے کہ چارپائی کو بنوایا جائے تاکہ سردیوں کی شام میں اس پر بیٹھ کر چائے کا مزہ لے کر پرانی یاد تازہ کی جا سکے۔ مگر بیوی بچوں کا ذہن اس طرح کا نہیں ہوتا۔ گھر کا سربراہ بیوی بچوں کو خبر دیے بغیر چارپائی بننے والے کے پاس جاتا ہے مگر کافی لوگوں سے پوچھ پوچھ کے بعد اسے چارپائی کی رسیاں مل جاتی ہیں لیکن بننے والا بڑی مشکل سے پوچھ پوچھ کے بعد ایک جگہ سے ملتا ہے۔ طے یہ ہوتا ہے کہ مرکزی کردار چھٹی کے دن صبح چھ بجے خود بننے والے کو لینے جائے گا۔ جب وہ گھر آتا ہے تو بیوی کو پتہ چل جاتا ہے۔ وہ ہنگامہ کرتی ہے کہ اتنے زیادہ پیسے فضول چیز پر لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ گھر کی چیزیں پوری کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں فضول چیز کے لیے ہیں۔ بڑے بیٹے کا کہنا ہے کہ کیلکولیٹر لے کر دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں لیکن چارپائی بنوانے کے لیے پیسے ہیں۔ رات تک ماحول کافی کشیدہ ہوتا ہے۔ اب اس کو (مرکزی کردار) کو خود بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ اس نے بیٹھے بٹھائے مصیبت مول لی ہے۔ اس کو اب پچھتاوا ہوتا ہے کہ وہ گھر کی ضرورتیں ہی پوری کر لیتا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ دکاندار کبھی بھی چیزیں واپس نہیں لے گا۔

آخر اگلے دن چارپائی بنوانے والے کو لے کر آتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ بھائی چارپائی اچھی بننا۔ جب چارپائی بن کر تیار ہو جاتی ہے تو یوں لگتا ہے کہ ست رنگا پرندہ اپنے پر پھیلائے پورے صحن میں چہک رہا ہے۔ بیوی بچے چارپائی کی خوبصورتی کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ ان کو بہت زیادہ پسند آتی ہے۔ پھر مرکزی کردار اپنے دوست کے یہاں چلا جاتا ہے۔ جب رات کو واپس آتا ہے تو لیٹنے کے دوران اس کا سانس رکنے لگتا ہے۔ ہاسپٹل لے جایا جاتا ہے مگر سانس کی ڈوری پہلے ہی ٹوٹ جاتی ہے۔ ایک کہرام برپا ہو جاتا ہے۔ بیوی اور بچے ایمبولنس میں اس کے خالی وجود کو گھر لاتے ہیں۔ کوئی پوچھتا ہے لاش کہاں رکھنی ہے۔ کوئی بیڈ کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ایک طرف سے ایک اماں کی آواز آتی ہے کہ گھر میں کوئی چارپائی نہیں۔ روندھی ہوئی آواز میں بچے چارپائی کہتے ہیں اور اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہیں۔ بیوی بتاتی ہے کہ اوپر پڑی ہے اور ساتھ ہی اس کی سسکیاں بین میں بدل جاتی ہیں۔ مرکزی کردار کے خالی وجود کو چارپائی پر رکھ کر صحن میں رکھ دیا جاتا ہے۔

رشید امجد نے اس افسانے میں چارپائی کو علامت کے طور پر لے کر ہماری توجہ اپنی پرانی آباؤ اجداد سے جڑی ہوئی ثقافت کی طرف کروائی ہے کہ انسان جب ترقی کرتا ہے تو اپنی پرانی ثقافت کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے اور جدید اشیاء پر خوش ہوتا ہے۔ پھر پرانی چیزوں کا نام لینا پسند نہیں کرتا جن کو وہ ایک عرصہ دراز سے استعمال کرتا چلا آتا ہے۔ بیوی بچوں سے جب بھی اندرون شہر کا ذکر کیا جائے تو انھیں ناگوار گزرتا ہے۔ ان کے برعکس مرکزی کردار اپنے سکون کے لیے وہاں اکثر جاتا ہے اور پرانے ماحول کو یاد کرتا ہے کہ شام کے وقت سارے لوگ چارپائی پر بیٹھ کر گپ شپ لگایا کرتے تھے اور ساتھ میں چائے کے مزے لیا کرتے تھے۔ مگر نئی جگہ آنے کے بعد وہاں کوئی ایسا ماحول نہیں ہے۔ ہر کوئی اپنی زندگی میں مگن ہے۔ کسی کو کسی دوسرے سے کوئی سروکار نہیں۔

رشید امجد کا یہ افسانہ ایک عام سی گھریلو زندگی سے شروع ہوتا ہے اور پھر آخر میں یہ ایک المیہ کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ مرکزی کردار کی موت اس افسانے کے اختتام کو ایک المیے کی شکل دے دیتی ہے۔ وہ اپنی خواہش کے بل بوتے پر چارپائی بنواتا ہے۔ دراصل وہ اپنی پرانی ثقافت کو زندہ کر رہا ہوتا ہے۔ بظاہر سب کو لگتا ہے کہ یہ کسی کام نہیں آئے گی مگر جب مرکزی کردار کی لاش کی رکھنے کی باری آتی ہے تو ایک اماں کے پوچھنے پر کہ گھر میں کوئی چارپائی نہیں ہے، شدت سے اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ گھر میں چارپائی کتنی ضروری ہے۔ کسی عورت کے کہنے پر:

"گھر میں چارپائی کتنی ضروری ہے" ۔ کسی عورت نے دوسری عورت کے کان میں کہا اور ہمارے گھروں میں اب اس کا رواج نہیں۔ (۴)"

رشید امجد عورت کے ان جملوں کے ذریعے ہمارے سامنے جدید معاشرے کے موجودہ حالت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ نئے دور میں گھروں میں چارپائی رکھنے کا رواج ختم ہو گیا ہے۔ نئے اور طرح طرح کے بیڈ اب کمروں کا حصہ بن گئے ہیں۔ حالانکہ چارپائی کی ہر گھر میں ضرورت ہے لیکن اس بات کو لوگ نہیں سمجھتے۔ رشید امجد نے یہاں "سامان" کو نئی اور پرانی تہذیب کی علامت کے لیے لیا ہے کہ پرانی تہذیبی اقدار ختم ہو گئی ہیں اور نئی تہذیبی اقدار کو فروغ ملا۔ مرکزی کردار کی مشقت اور پھر اس کے بعد موت سے یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنی پرانی تہذیب کو زندہ کرنے کے لیے زندگی گزار رہا تھا اور جب پرانی تہذیب کی علامت یعنی "چارپائی" کو بنوالیا تو اس نے اپنا کردار پورا کر دیا اور آخر کار "ست رنگ پرندے" کو صحن کے وسط میں چہچہاتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنا فرض پورا کر دیا۔

ست رنگا پرندہ پورے صحن میں اپنے خوبصورت پر پھیلائے چہچہا رہا ہے مگر اس کی چہچہاہٹ کسی کو سنائی نہیں دے رہی۔ ہر سو اداسی کی وجہ سے اس کے رنگوں کی خوبصورتی کسی کو دکھائی نہیں دے رہی۔ ہر طرف سوگ کا سماں ہے۔ اس کہانی سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ انسان کی خواہشات کی قدر کرنی چاہیے۔ پرانی تہذیب وروایات کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ان کے وجود کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے کہ وہ پہلے دور کا حصہ بنی رہیں۔

افسانہ "جواز" انسان کی داخلی دنیا کی ایک سچی تصویر پیش کرتی ہے جس میں اعتماد کی قیمت ہر انسان کو اپنے خوابوں کی دنیا بکھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہانی کے مرکزی کردار کے ساتھ ہونے والا دھوکہ جو ظفر نامی شخص کرتا ہے۔ اس کے بعد انسان کے اندر پیدا ہونے والی مایوسی کو بہت خوبصورتی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ معاشرتی روابط میں اعتماد کی اہمیت کتنی زیادہ ہے اور جب یہ ٹوٹتا ہے تو انسان کس طرح ٹوٹ جاتا ہے۔ دھوکہ ہمارے معاشرے میں بہت عام ہو گیا ہے اور انسانیت ختم ہو گئی ہے۔ ایک انسان دوسرے کو دھوکہ دے کر خود تو فرار ہو جاتا ہے مگر دوسرے انسان کی ساری محنت کو مٹی میں ملا دیتا ہے۔

کہانی کا مرکزی کردار ظفر نامی آدمی پر بھروسہ کرتا ہے۔ وہ اس کو اس بات پر بھی قائل کر لیتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو کوئی بات نہیں بتائے گا کیونکہ اس کی بیوی اس بات پر آمادہ نہیں ہوتی کہ اس کا شوہر (کہانی کا مرکزی کردار) کسی پر دوبارہ بھروسہ کرے۔ کیونکہ وہ پہلے بھی کافی لوگوں پر اعتماد کرنے کا نتیجہ بھگت چکا ہوتا ہے اور پھر کچھ وقت تک اپنی ذات کی گہرائیوں میں گرنے کے بعد نکلتا ہے تو پھر کسی اور پر اعتماد کر لیتا ہے۔ وہ ظفر کی باتوں میں آکر بیوی کو بے خبر رکھ کر سارے معاملات طے کر لیتا ہے۔ کچھ عرصہ تو رقم گھر آتی ہے لیکن پھر ایسا ہوا کہ وقفہ آنے لگا اور ایک دن تو سب ختم ہو گیا۔ جب پتہ چلا کہ ظفر سب کچھ سمیٹ کر غائب ہو گیا ہے تب جا کر اس کو اس چیز کا احساس ہوتا ہے کہ وہ پھر ایک اور دفعہ کسی اور پر اعتماد کر کے دھوکہ کھا گیا ہے۔ مگر یہ وار اتنا شدید ہوتا ہے کہ اس مرتبہ اس کو کہیں چھپنے کی جگہ نہیں ملی۔ بینک سے دھمکیاں ملنے لگی کہ قرض ادا نہ کیے تو مکان خالی کرا لیا جائے گا۔ بچوں کی فیس ادا کرنا مشکل ہو گئی۔ خرچے کے لیے پیسے نہیں۔ بچے اور بیوی کا تلخ و تشنہ لہجہ اور طعنے ان سب چیزوں نے اس کو یہ موقع ہی نہیں دیا کہ وہ اپنی ذات کی گہرائیوں میں گم ہو سکے۔ قرض داروں کی دستک تیز ہو گئی اور اب تو یہ حال تھا کہ وہ دفتر تک پہنچ جاتے تھے۔ گاڑی بیچنے کا سوچا لیکن اس کے سارے کاغذات غائب تھے۔ کاغذات ظفر کے پاس تھے۔ جو امید تھی کہ گاڑی بیچ کر کچھ قیمت تو مل جائے گی لیکن وہ امید کی شمع بجھ گئی۔

اس کہانی میں اس جگہ آکر مرکزی کردار موت، مایوسی، ناامیدی جیسی کیفیات کا شکار ہو جاتا ہے۔ موت اٹل حقیقت ہے تو اس سے کوئی انکار نہیں لیکن ہر مشکل کا حل موت نہیں ہوتا۔ دنیا کی زندگی میں بہت سی مشکلات آتی ہیں۔ پریشانیاں، مصیبتیں انسان کی زندگی کا حصہ ہیں۔ اس سے انسان بھاگ نہیں سکتا۔ اس لیے وہ مایوس ہو کر موت کی تمنا کرتا ہے۔ مشکلات سے مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ بس اس وقت صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے. اور ہمت و بہادری سے مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

ادھر ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے کہ ہر کسی پر بھی اندھا دھند اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ ضروری نہیں کہ ہر کوئی آپ سے مخلص ہو۔ کچھ ظفر جیسے لوگ بھی آپ کی زندگی میں آتے ہیں جو گہرا دھوکہ دیتے ہیں کہ انسان کافی عرصے تک اپنے آپ کو سنبھال ہی نہیں پاتا۔ یہ نہیں کہ کسی پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ اعتماد کرنا چاہیے کچھ لوگ منور جیسے بھی ہوتے ہیں جو بغیر حرص و ہوس اور لالچ کے آپ سے بہت مخلص ہوتے ہیں اور انسان کی زندگی پر مثبت اور گہری چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔

منور ایک پراسرار، مثبت اور خلوص سے گندھا ہوا کردار ہے۔ جب پہلی ملاقات کرتا ہے تو اس کی پریشانی کو بھانپ لیتا ہے اور اس سے پوچھتا ہے کہ وہ کیوں پریشان ہے مگر وہ کچھ نہیں بتاتا۔ منور کہتا ہے کہ وہ اس پر بھروسہ کرے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی کوئی مدد کر سکے۔ " مدد" وہ تلخی سے کہتا ہے، یہ بات بالکل سو فیصد ٹھیک ہے کہ اتنی بار بھروسہ کرنے کے بدلے جب آپ کو دھوکہ ہی ملے تو ایک وقت آتا ہے کہ آپ دوسروں کو صحیح نہیں سمجھتے اور نہ ہی اعتماد کرتے ہیں کہ کہیں دوبارہ دھوکہ نہ مل جائے۔ منور کے اصرار کرنے پر مرکزی کردار اپنی کہانی بتاتا ہے۔ منور اس کو مشورہ دیتا ہے اور اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ منور کے ذریعے پہلے بینک کی قسط ادا ہوتی ہے۔ پھر گھر کا مسئلہ حل ہوتا ہے پھر اس کو پارٹ ٹائم جاب ملتی ہے جس پر وہاں کے ورکرز بھی حیران ہو جاتے ہیں کہ یہ جگہ تو ابھی کل ہی خالی ہوئی تھی اور اتنی جلدی فل بھی ہو گئی۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ایک سیٹ کافی دن خالی رہتی ہے، پھر انٹرویوز ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک فرد کو سلیکٹ کیا جاتا ہے پھر جا کر وہ جگہ اس کو دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ منور گاڑی کا مسئلہ بھی حل کرتا ہے۔ تھوڑے وقت کے بعد دو پارٹ ٹائم جاب مرکزی کردار کی قسمت بنتی ہیں جس کی وجہ سے اس کے حالات ٹھیک ہو جاتے ہیں اور وہ منور کا مشکور ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں جو Nostalgia کو کم کرنے میں مدد دیتے ہیں جیسے منور۔ مرکزی کردار کہتا ہے:

> "چند دنوں میں کئی کام بگڑے کام سیدھے ہو گئے۔ سب سے بڑھ کر کہ منور کی حوصلہ افزا باتوں اور مشوروں نے میرا کھویا ہوا اعتماد بحال کر دیا۔
> میں آہستہ آہستہ زندگی کی دوڑ میں شامل ہونے لگا۔ (۵)"

منور جیسے لوگ بہت انمول ہوتے ہیں جو بغیر کسی غرض کے دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ ان کا دل انسانیت کی ہمدردی سے بھرا ہوتا ہے۔ منور کوئی بہت بڑی پوسٹ نہیں رکھتا بلکہ وہ ایم اے کا سٹوڈنٹ تھا اور دھمیال روڈ پر رہتا ہے۔ اپنے دوست کے ساتھ امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ ایک بہت اچھا اور خلوص دل رکھتا ہے۔ اس کا کردار بہت پراسرار سا ہے۔ اس کا کردار اس بات کی طرف نشاندہی کرتا ہے کہ دنیا میں اچھے لوگ موجود ہیں۔ منور امید کی کرن ہے۔

افسانے میں رشید امجد کرداروں کے ذریعے معاشرے کی تلخ حقیقت کو پیش کرتے ہیں۔ ظفر کا دھوکا دہی کا کردار ہمارے معاشرے میں موجود برائیوں میں سے ایک برائی ہے۔ غریب اور مجبور لوگ بہت مشکل سے کماتے ہیں۔ بہت مشقت سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ جب اس کے ساتھ دھوکے والا حادثہ ہوتا ہے یا کوئی ان کی کمائی چوری کر لیتا ہے۔ وہ لوگ اپنا کام تو کر

لیتے ہیں لیکن پھر دوسرے ایسے مجبور لوگوں کے پاس پھر کوئی بھی چارہ نہیں رہتا۔ کوئی راہ نہیں بچتی تب ہی وہ خودکشی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اس طرح کئی لوگ خودکشی کے مرتکب بنتے ہیں۔

مرکزی کردار ہمارے معاشرے کی ایک حقیقت کی عکاسی ہے۔ افسانے کی ابتدا ہی مرکزی کردار کی اپنی ذات کے اندر گہرائی میں گرنے اور ٹوٹے ہوئے اعتبار سے ہوتی ہے۔ مرکزی کردار کمزور شخص دکھایا گیا ہے جو بار بار دوسروں پر بھروسہ کرتا ہے اور اتنا ہی اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ مگر ظفر کا دیا ہوا جھٹکا اتنا شدید اور گہرا ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کی گہرائیوں میں گرتا چلا جاتا ہے۔ اب اسے لگتا ہے کہ شاید وہ کبھی نہ اٹھ پائے۔ اس کے بعد وہ دوسروں پر بھروسہ کرنے میں ہچکچاتا ہے۔

مرکزی کردار کی زندگی میں جب منور آتا ہے تو وہ ایک ایک دفعہ پھر لیکن بہت دیر کے بعد اس پر بھروسہ کرتا ہے لیکن ہچکچاہٹ ہر وقت اس کے ساتھ رہتی ہے کیونکہ وہ ایک بار پھر کسی پر بھروسہ کرنے کا رسک لیتا ہے۔ منور کی بہترین بات تھی کہ وہ وعدے وعید یا کوئی بات پہلے سے طے نہیں کرتا تھا بلکہ مدد ہی اس طریقے سے کرتا کہ مرکزی کردار خود بھی حیران رہ جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ منور پر بھروسہ کر کے پچھتایا نہیں۔ منور نے اس کو اپنے آپ پر اعتماد کرنا سکھایا۔ یہ سچ ہے کہ مثبت لوگ انسان کی زندگی میں مثبت تبدیلیاں لاتے ہیں اور منفی لوگ منفی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ بہترین دوست رکھنے چاہیں جو آپ کے ساتھ پُر خلوص ہوں اور آپ کو اچھے مشورے دیتے ہوں۔ آپ کے لیے اچھا سوچتے ہوں۔ اچھے لوگ بھی اس دنیا میں ہوتے ہیں اس بات کا اندازہ ہمیں منور کے کردار سے ہوتا ہے۔ ایسے لوگ دوسروں کی مدد بغیر کسی معاوضے کے کرتے ہیں۔

منور کے کردار سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ لوگوں کو اس بات کا یقین لانے کے لیے زندہ رہا کہ اس دنیا میں اچھے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ کہانی کا اختتام المیاتی اختتام ہے۔ منور کی موت کی خبر مرکزی کردار کو اس حد تک صدمہ دیتی ہے کہ یہ خبر سننے کے بعد اس کے پاس کچھ الفاظ کیا ایک لفظ بھی نہیں بچتا کہ وہ اس بارے میں کچھ کہہ سکے۔

"لیکن۔۔۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ نہیں سوجھے۔(۶)"

اچھے لوگ بہت جلد چلے جاتے ہیں مگر اپنے پیچھے معاشرے اور لوگوں میں ایک مثبت سبق اور صدمہ کی طویل خاموشی دے جاتے ہیں۔

رشید امجد کا افسانہ " تلاش " حال اور ماضی کے درمیان سفر کرتا محسوس ہوتا ہے۔ ہر وقت حال اور ماضی کا موازنہ چلتا رہتا ہے۔ کبھی حال سے ماضی اور کبھی ماضی سے حال میں آتے ہیں۔ مرکزی کردار جس کا نام آغا نعمت ہے۔ اپنے بیٹے اور دوست کے ساتھ فلائنگ کوچ پر سوار ہو کر لاہور کی طرف سفر کر رہا ہے۔ کوچ جب جہلم کے پل سے گزر رہی تھی تو اس کے پاس کی سڑک اور چلنے والی ہوا حال اور ماضی کے درمیان اٹھکیلیاں کرتی کسی نامعلوم لمحے میں ٹھہر رہی تھی۔

جس طرح اس افسانے میں فلائنگ کوچ اور گھوڑوں کا ذکر ہے۔ اس طرح رشید امجد کے دیگر افسانے " دھند " میں "بس" اور "دھند میں نکلتا دن" میں گھوڑوں کا ذکر نظر آتا ہے۔ آغا نعمت اپنی سوچ میں اس طرح غرق ہوتا ہے کہ بیٹے کے پوچھنے پر بھی وہ جواب نہیں دے پاتا۔ اس کا دوست حسن جان بھی آغا نعمت کو بلاتا ہے لیکن وہ توجہ نہیں دے پاتا۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے حسن جان کہتا ہے کہ جیسے جیسے لاہور قریب ارہا ہے، تمہارے چہرے پر فکر کی گہری چھاپ واضح ہوتی جارہی ہے۔ آغا نعمت کھوئے کھوئے سے انداز میں کہتا ہے شاید۔ دراصل وہ اس بات کا خود بھی فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ وہ خود کیا چاہتا ہے۔ ہاں اور ناں کے بھنور میں پھنسا ہوا ہے۔ آغا نعمت سوچتا ہے کہ اگر اسے گوہر جان نہ ملی تو کیا ہوگا۔ پتہ نہیں کہاں ہوگی شاید آگے چلی گئی ہو۔ گوہر جان آغا نعمت کی ماضی میں رہنے والی محبوبہ ہے جو اس سے بچھڑ جاتی ہے۔ وہ اس کو ہر جگہ تلاش کرتا پھرتا ہے۔ یہاں تک کہ لاہور آتے وقت بھی نوکری کے علاوہ گوہر جان کو بھی تلاشنے کی نیت سے ادھر آتا ہے۔ حسن جان اپنے دل میں پنپتے خیال کو زبان پر لے آتا ہے اور آغا نعمت سے پوچھتا ہے کہ وہ صرف نوکری کی تلاش میں جارہا ہے یا کسی کو ڈھونڈنے بھی۔ یہاں بھی وہ کہتا ہے کہ ہاں شاید دونوں ہی۔ خیبر سے گزرتے ہی اسے گوہر جان سے آخری ملاقات یاد آتی ہے۔ وہ اسی یاد میں ماضی میں گم ہوتا چلا جاتا ہے۔

آلوچوں کے باغ میں پھول کھل رہے تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں اداسی تھی کہ وہ جلد ہرات چھوڑنے والے ہیں۔ گوہر نے بتایا کہ اس کے ابّا دہلی یا آگے لاہور جانا چاہتے ہیں۔ اغا نعمت کے پوچھنے پر کہ وہ وہاں کیا کریں گے۔ بتاتی ہے کہ کسی امیر کے حرم میں ہم دونوں بہنوں کو بیچ دیں گے اور اس کے بدلے میں کوئی خلعت۔۔۔۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت اور بہت بڑا المیہ ہے کہ لوگ اپنی بیٹیوں بہنوں کو کسی امیر کو پیش کر دیتے اور اس کے بدلے معاوضہ لیتے ہیں۔ وہ معصوم لڑکیوں کے جذبات اور ان کی تکلیف کا احساس نہیں کرتے بلکہ پیسوں کے لالچ کی کی پٹی ان کی آنکھوں پر بندھی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ صحیح غلط کے فرق میں اندھے ہو جاتے ہیں۔

آغا نعمت اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے جیسے وہ وقت کے بے رحم لمحے سے بچا لے گا۔ وہ کہتا ہے کہ میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔ مگر وقت کا بے رحم پہیہ گھومتا ہے اور سب پر اپنی بے رحم چھاپ چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ آغا نعمت کو ہرات سے دو دن کے لیے جانا ہوتا ہے۔ لیٹ ہونے کی وجہ سے ہفتے بعد آتا ہے مگر اس کے آنے سے پہلے ہی ہرات اجڑ چکا ہوتا ہے اور گوہر جان کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ بیٹے کی آواز سے وہ حال میں پہنچتا ہے جو اس سے پوچھ رہا ہوتا ہے کہ وہ لاہور کب تک پہنچیں گے۔ حسن جان کو پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ آغا نعمت سے پوچھتا ہے مگر آغا نعمت کندھے اچکا دیتا ہے۔

بیٹے کو ایک دن وہ انار کلی گھماتا ہے۔ واپس آنے لگتا ہے تو بیٹا شالامار دیکھنے کی بھی خواہش کرتا ہے لیکن شالامار کا نام سنتے ہی اس کی حالت خراب ہونے لگتی ہے۔ اس کے منع کرنے کے باوجود بیٹے کی ضد کے آگے ہار مان کر وہ شالامار آ جاتا ہے۔۔ ادھر آکر اسے ہر جگہ ویرانی کے احساس ہوتا ہے۔ پہلے تختے کے فوارے چل رہے تھے۔ یہاں اکر وہ ایک بار پھر ماضی میں کھو کر گوہر جان سے بچھڑنے سے پہلے کی گئی ملاقات کو یاد کرتا ہے۔ جب وہ اچانک کسی طرح ”گوہر جان“ سے ملاقات کرتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ گوہر جان اسے دیکھ کر خوش نہیں ہوئی بلکہ وہ خوفزدہ ہو گئی ہے۔ وہ اس کا سبب پوچھتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ وہ اب شاہی حرم میں ہے۔ یہ بات سنتے ہی آغا نعمت کی چیخ نکل جاتی ہے۔ اس کی چیخ سے گوہر جان ڈر جاتی ہے۔ وہ اسے جانے کو کہتی ہے۔ اسی دوران کوئی ان کی طرف آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ گوہر اسے زور سے پیچھے دھکیلتی ہے اور یہاں سے جانے کا کہتی ہے اور خود اندھیرے میں تیزی سے بھاگتی ہوئی گم ہو جاتی ہے۔

”ابو کہاں کھو گئے“ بیٹے کی آواز اس کو حال میں لے آتی ہے۔ اس کی نظر گھنے درخت پر پڑتی ہے جو اب بھی وہیں کھڑا ہوتا ہے مگر کھوکھلا ہے۔ اندر چیونٹیوں اور کیڑیوں کی قطاریں تھیں۔ ان کو دیکھتے ہی اس کے سارے جسم پر درد کی سوئیاں چبھنے لگیں۔ وہ فوراً جانے لگتا ہے۔ ایک دم رک کر وہ دیکھتا ہے اور کچھ بڑبڑاتا ہے۔ بڑے دروازے سے تیزی سے نکلتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا۔ دور سے گوہر جان کی خوف زدہ آنکھیں کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یہ افسانہ پورا کا پورا ماضی اور حال کے گرد گھومتا ہے۔ مرکزی کردار ماضی کی تلاش میں ہے۔ وہ اپنے سے جڑے ماضی کے رشتے کو تلاش کر رہا ہے۔ وہ ہر وقت بے چینی اور اضطرابی کی کیفیت میں ہے۔ وہ حال میں ہوتے ہوئے بھی اپنے ماضی کی خوبصورت یادوں میں کھونا چاہتا ہے۔

”چند لمحے صدیوں جیسے طویل تھے۔(۷)“

دیگر افسانوں کی طرح رشید امجد نے اس افسانے میں بھی صدیوں اور لمحوں کا ذکر کیا ہے۔ چند لمحے اتنے بھاری ہوتے ہیں کہ صدیوں پر محیط نظر آتے ہیں اور تو کبھی صدیاں نقطوں کا سفر طے کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ شالامار وہ جگہ ہے جو آغا نعمت کو ماضی کے وقت کی بے رحمی کی یاد دلاتا ہے۔ جہاں وہ اپنی محبوبہ گوہر جان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاتا ہے۔ وہ حال میں رہ کر بھی اس کو ہر جگہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

افسانے کے آغاز سے ہی گوہر جان کے گم ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ آخر میں جب آغا نعمت شالامار میں موجود اسی گھنے درخت کو دیکھتا جس کی طرف ماضی میں اس رات گوہر جان تیزی سے بھاگتی گم ہو جاتی ہے۔ رات کے اندھیرے میں وہ جگہ کا صحیح تعین نہیں کر پاتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ بھاگ گئی ہے۔ مگر اب اس گھنے درخت کو دیکھتے ہی وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ وہ اس وقت بھاگی نہیں تھی، پکڑی گئی تھی کیونکہ بھاگ جانے کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ یہ افسانہ آغاز سے تلاش کا سفر کرتا ہوا آخر میں انجام پاتا ہے۔ آغا نعمت کی محبت کی شدت ہے کہ وہ حال میں ہوتے ہوئے بھی ہر وقت ماضی کی یادوں میں سفر کرتا ہے۔ افسانے میں بے نام کردار اور بے چہرہ انسان معاشرے کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایسے کرداروں اور افسانوں کے مجمع میں انسان کو خود اپنی شخصیت اور اپنی پہچان کی تلاش کرنی ہوتی ہے۔

رشید امجد کا افسانہ ”پھول تمنا کا ویران سفر“ دوسرے افسانوں سے منفرد ہے۔ یہ افسانہ تجسس سے بھرا ہوا ہے۔ آغاز سے انجام تک تجسس کی فضا طاری رہتی ہے مگر اختتام میں وہ تجسس ایک لمحے میں ختم ہو جاتا ہے اور مرکزی کردار کی زندگی کا سارا راز کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو برسوں سے کسی کے انتظار میں زندگی گزار رہا ہے اور اس امید میں ہے کہ کب اس کی خواہش پوری ہو اور وہ چہرہ دیکھنا نصیب ہو۔ جس کا برسوں سے اس نے انتظار کیا ہے۔ مرکزی کردار روز شام ہوتے ہی بس کے اڈے پر چلا جاتا ہے اور وہاں لگے بینچ پر بیٹھ کر چائے والے کھوکھے سے چائے لینے اور روز آنے والی بسوں کا انتظار کرتا ہے۔ جب بھی کوئی بس آتی ہے وہ چائے چھوڑ کر آنکھوں میں خوشی کی چمک لیے بس سے اترنے والے ہر مسافر کو دیکھتا ہے اور مطلوبہ چہرہ دیکھنے کی امید میں آخری مسافر تک دیکھتا ہے مگر جب بس خالی ہو جاتی ہے تو جو آنکھیں پہلے خوشی سے چمک رہی ہوتی ہیں ان کی چمک ماند پڑ جاتی ہیں اور وہ نا

امید ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگلی شام پھر وہ ایک نئے جذبے اور امید سے آتا ہے یہ سلسلہ برسوں سے چل رہا ہے۔ انتظار میں اس کی عمر ڈھل گئی۔ وہ نوجوان شخص سے ادھیڑ عمر شخص نظر آنے لگا۔ اس کے تسلسل میں فرق نہیں آتا چاہے موسم سرد ہو گرم ہو بارش بہت تیز بھی۔ وہ اپنے ٹائم پر ضرور آتا ہے اور روز آتا ہے۔ اسے کسی بھی قسم کے موسم سے فرق نہیں پڑتا۔

شروع شروع میں اس شخص کے آنے پر چائے والے اور ادھر کے لوگوں کو لگتا تھا کہ یہ شاید سی آئی ڈی کا بندہ ہے جو اپنی ڈیوٹی کرنے آتا ہے مگر تھوڑے عرصے بعد اس کو اپنی رائے خود ہی بدلنی پڑی اور یہ شخص بھی اسے اڈے کی دوسری چیزوں کی طرح ایک حصہ لگنے لگا۔ اس شخص کی پرسنیلٹی اتنی بارعب تھی کہ کسی میں اتنی ہمت ہی نہ ہوتی کہ اس سے پوچھے وہ کون ہے اور کہاں سے ہے اور کیا کرنے آتا ہے۔ اس کے برسوں سے آنے کی وجہ سے چائے والے کے باقاعدہ طور پر علم تھا کہ کب چائے پینی ہے اور اس کے بعد کتنی دیر بعد دوبارہ چائے دینی ہے۔ ادھر سرو کرنے والے لڑکے بھی جانتے تھے اور سرو کرنے والا لڑکا جانے سے پہلے دوسرے لڑکے کو اس کے بارے میں بتا کر جاتا ہے۔ مرکزی کردار ایک ہی مرتبہ چائے کے پیسے آخر میں دے کر جاتا ہے، بار بار نہیں دیتا۔ چائے والے کی دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ کوئی شخص اسے جیسا دکھتا تو فوراً جا کر دیکھتا کہ شاید وہ شخص آیا ہے۔ کئی برس کے ساتھ نے چائے والے کو اس کا عادی بنا دیا۔ ایک حیران کن بات یہ تھی کہ وہ بینچ کے علاوہ کہیں بھی نہ بیٹھتا تھا۔ ایسے تو زیادہ تر بینچ خالی ہی ہوتا تھا لیکن اگر کوئی بیٹھا ہوتا تھا تو وہ ٹہل کر بینچ کا حالی ہونے کا انتظار کرتا اور خالی ہونے کی صورت میں وہ بینچ پر جا کر بیٹھ جاتا۔ ایک دن شدید بارش ہونے کی وجہ سے بوڑھے شخص کی حالت کافی خراب ہو رہی تھی چائے والا سمجھ گیا کہ اسے سردی لگ گئی ہے اس نے اسے فوراً چائے بنا کر دی۔ اگلی شام بارش بہت تیز تھی مگر حیرت کا جھٹکا اس بات پر لگا کہ جب وہ شخص معمول کی طرح شام نہ آیا کچھ دنوں کے بعد موسم ٹھیک ہوا اور صبح دھوپ نکلی تو لڑکے کو تجسس تھا کہ شاید آج بابو آجائیں گے۔

اس شام وہ تو نہ آیا لیکن ایک عجیب واقعہ ہوا کہ لاہور سے آنے والی بس سے ادھیڑ عمر کی عورت نکلی اور سیدھا اس بینچ کی طرف گئی کافی دیر گم صم اس کے پاس ٹھہری رہی۔ جیسے ماضی کے اوراق میں گم ہو رہی ہو اور پچھتاوے کی گہرائیوں میں ڈوب رہی ہو۔ عورت نڈھال ہو کر کرسی پر گر پڑی۔ اس عورت کا ایک نوجوان بیٹا بھی تھا جو بس سے ٹیچی لے کر نکلا اور بینچ کے پاس آ گیا۔ اس عورت کا رونا اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ وہ ماضی کو جانتی ہے اور اس میں اس کا بھی کردار ہے۔ جسے یاد کر کے وہ رو رہی ہے۔ وہ دوپٹے سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولنے لگی:

”بیس برس پہلے ایسی ہی ایک شام میں یہاں سے لاہور گئی تھی۔[۸]“

پھر وہ کچھ یاد کرنے کے لیے چپ ہو گئی۔

”دو ہی دن کے لیے تو گئی تھی۔

”پھر“۔ بیٹے نے تجسس سے پوچھا۔

ابو نے میری شادی کر دی۔۔۔ جھٹ پٹ۔۔۔۔ ایک ہفتے کے اندر فو گو اندر۔۔۔۔ تمہارے ابو لندن جو جا رہے تھے۔[۹]“

وہ اداس لہجے میں کہتی ہے کہ بیس برس بیت گئے ہیں لیکن یہ بینچ ابھی بھی پڑا ہے۔ پھر بیٹے کو لے کر وہ وہاں سے چلی جاتی ہے۔ کہانی ایک عجیب کیفیت پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔

افسانے میں چائے والا کردار نہایت دلچسپ ہے۔ چائے والے کی غائبانہ مرکزی کردار سے محبت ایک عجیب تاثر دیتی ہے۔ وہ روز چائے پینے والے شخص کی عادت و اطوار سے خوب واقف ہو جاتا ہے۔ کئی برس کے ساتھ کی وجہ سے چائے والا اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ رشید امجد نے یہاں ماضی کی نشاندہی کے لیے بینچ کو علامت بنایا ہے۔ مرکزی کردار کی بینچ کے ساتھ شدید انسیت و وابستگی کے علاوہ کہیں اور نہ بیٹھنا اور بینچ خالی ہونے کا انتظار کرنا اور افسانے کے اختتام پر جب عورت بس سے اترتی ہے تو سیدھا بینچ کے پاس آتی ہے اور غمگین ہو کر اس پر گر گئی۔

ادھر یہ بات کھل کر واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ ادھیڑ عمر شخص اور اس ادھیڑ عمر عورت کا ماضی میں الفت کا رشتہ تھا اور وہ اکٹھے اس بینچ پر وقت گزارا کرتے تھے جو دونوں کو اس بینچ سے جڑی خوبصورت ماضی کی یادیں دلاتی ہیں۔ مرکزی کردار کی ابتدا اسے خاموشی چلتی ہے۔ اس کا کردار افسانے میں آغاز سے لے کر انجام تک جاری رہتا ہے مگر اس میں ایک بھی

مکالمہ نہیں ہے لیکن اس کا کردار بہت جاندار ہے کہ چپ رہنے کے باوجود اس کی خاموشی بولتی ہے اور ہر بات واضح کرتی ہے۔ کہانی کے اختتام پر مرکزی کردار کی زندگی کا سارا راز کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ ساری زندگی وہ جس انتظار کی بس میں سوار رہا۔ وہ اس کی موت کے بعد اسٹیشن پر آکر رکی۔

رشید امجد علامتوں کا استعمال نہایت ہنر مندی سے کرتے ہیں۔ افسانہ "دھند" میں بھی "دھند" ایک علامت کے طور پر نظر آتی ہے۔ دھند نہ صرف موجود ہے بلکہ چھائی ہوئی کیفیت میں ملتی ہے۔ ان کے یہاں دھند سیاسی حوالوں اور معاشرتی رویوں کے منفی زاویوں کا حوالہ بن کر ابھرتی ہے۔ کہانی میں مرکزی کردار اپنے آفس میں بیٹھا کھڑکی سے باہر پھیلی ہوئی دھند کا مشاہدہ کر رہا ہے اور معاشرے میں پھیلی ہوئی بے شناختی اور کرب کو محسوس کر رہا ہے۔ وہ تنہا دفتر میں بیٹھا اپنی فائل میں کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہے جو اسے صبح دفتر میں جمع کروانی ہے مگر وہ سمجھ نہیں پا رہا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ بے بس ہو کر لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی دھند کی سیاہ چادر کو دیکھ رہا ہے اور کشمکش کے دھند لکے میں گم ہو رہا ہے۔ دفتر میں سب جا چکے ہیں۔ باہر صرف ایک چپڑاسی دروازے کے پاس بیٹھا اونگھ رہا ہے اور یہ اندر بیٹھا کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ لکھنے کی کوشش کے باوجود لکھا نہیں جا رہا۔ صرف دو چار سطروں کے بعد ایسے لگ رہا ہے جیسے لفظ کترا رہے ہوں۔

"قریب آتے ہیں لیکن قلم کی نوک تک پہنچتے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں، بکھر جاتے ہیں۔ (۱۰)"

گویا کہ لفظ بھی اپنی شناخت کھو رہے ہیں۔ بے یقینی کی فضا دھند کی صورت میں بڑھتی جا رہی ہے۔ آخر اسے یاد آتا ہے کہ اسے بیوی بچوں کا کچھ سامان گھر لے کر جانا ہے۔ وہ پھر کھڑکی سے دھند کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ آخر دفتر سے نکلتا ہے۔ دفتر سے نکلنے کے بعد وہ دھند کے سائے میں بہ مشکل سفر طے کرتا ہوا بس تک پہنچتا ہے۔ بس پر سوار ہونے کے بعد اسے باہر کے نظارے اور کچھ بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ مسافروں کے دھکم پیل سے کبھی آگے چلا جاتا ہے، کبھی پیچھے۔ آخر ایک سیٹ کے پاس پہنچ گیا۔ کچھ نہیں اندازہ تھا کہ بس کہاں جا رہی ہے۔

ہر طرف دھند کا ہی راج تھا۔ ہر چیز اپنی شناخت کھو رہی تھی۔ ہر طرف بے چینی اور بے یقینی کا عالم تھا۔ وہ سامان لے کر گھر کے اندر جیسے ہی داخل ہوتا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے اسے گھر کے گرم اور پُر سکون ماحول سے آرام محسوس ہوتا ہے۔ بیوی کو جلدی سے سامان پکڑا کر بستر میں گھس جاتا ہے۔ بچے سوئے ہوئے تھے۔ سونے سے تھوڑی دیر پہلے پڑھنے کی عادت تھی مگر بار بار دھند کی دستک یہ کام ممکن نہیں ہونے دے رہی تھی۔ بستر میں گھس جاتا ہے مگر یکدم جھٹکا کھا کر اٹھ جاتا ہے اور یہ گھر، یہ بستر اور بیوی اسے کوئی بھی اپنا نہیں لگتا۔ رفتہ رفتہ اسے ہر چیز بے شناخت ہونے لگنی شروع ہو جاتی ہے۔ بے یقینی اور بے اضطرابی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی اور اپنے رشتوں کی پہچان کھو دیتا ہے۔

رشید امجد کے افسانوں میں "دھند" مختلف کیفیات میں نظر آتی ہے۔ وہ کہیں خوف و دہشت میں، کہیں سچائی کی معدومیت کی طرف اشارہ کرتی ہے تو کہیں اجتماعی بے حسی، سیاسی جبر اور مارشل لا کے دور میں مزاحمتی رویوں کو جنم دیتی ہے تو کہیں چپ سادھ لیتی ہے۔ معاشرے کی گھٹن انسان کو اندر سے بھی کھوکھلا کر دیتی ہے اور زندگی کو مشکل بنا دیتی ہے۔ انسان فطرتاً آزاد پیدا کیا گیا ہے۔ وہ پابندیوں میں اپنی زندگی نہیں گزار سکتا۔ وہ آزاد فضا میں سانس لینے کا متمنی ہے۔ معاشرے کی گھٹن انسان کو اپنے آپ سے اور زندگی سے بیزار کر دیتی ہے۔ مرکزی کردار بھی اسی گھٹن میں مبتلا ہے۔ وہ ایک آزاد فضا میں سانس لینا چاہتا ہے جو اسے میسر نہیں ہے۔ اس کا دماغ ماضی اور حال کی کشمکش میں ڈولتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ماضی میں جو اطمینان نظر آتا تھا، مڑ کر دیکھنے پر وہ بھی چلا گیا۔ ایک ویران میدان دکھائی دینے لگا۔ آگے حال کے طرف دیکھے تو دھند ہی دھند ہے جہاں بھی پاؤں رکھے تو گم ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

رشید امجد نے اس افسانے میں مرکزی کردار کے ذریعے انسان کی داخلی بے نیتی دکھائی ہے کہ انسان چاہ کر بھی کوئی کام نہیں کر پاتا جب وہ وہاں اور ناں کے شکنجے میں جکڑا ہوتا ہے۔ انسان کچھ کرنے کا سوچتا ہے مگر ارد گرد کے حالات اسے لکھنے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ وہ اندر سے بھرپور اضطرابی اور بے چینی کی کیفیت کا شکار ہے۔ سیاسی و معاشرتی حالات سچ بولنے کا حق چھین لیتے ہیں اور حق بات جاننے کے باوجود ہمیں جھوٹ کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ یہاں مرکزی کردار کچھ لکھنے کی جستجو کر رہا ہے مگر وہ لکھ نہیں پا رہا۔ ہو سکتا ہے وہ سچ لکھنا چاہ رہا ہو مگر حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ شش و پنج میں مبتلا ہے کہ لکھوں نہ لکھوں، کیا کروں۔ طاہرہ اقبال لکھتی ہیں:

"رشید امجد کے افسانوں میں بہت آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن ان آوازوں میں عصری حالات کی گونج زیادہ واضح اور تیز ہے جب انسان اپنی شناخت گم کر رہا ہے۔ وہ بظاہر زندہ ہے لیکن دراصل مر چکا ہے۔ اُس کی زبان کٹی ہوئی ہے۔ ہاتھ لکھنے سے قصر ہیں، خارجی جبر کا غلبہ ہے جس نے آدمی کو مفلوج اور عضوِ معطل بنا ڈالا ہے۔ (۱۱)"

ACADEMIA International Journal for Social Sciences
Volume 4, Issue 3, 2025 ISSN-L (Online): 3006-6638

اس افسانے میں رشید امجد نے بس کو بھی ایک علامت کے طور پر دکھایا ہے کہ انسان کی زندگی کی بس بھی یونہی چل رہی ہے۔ کچھ پتہ نہیں کہ انسان کہاں جارہا ہے، کہاں رکنا ہے اور کہاں چلنا ہے۔ کچھ لوگ اپنا سفر زیست ختم کرتے ہیں اور زندگی کی اس بس سے اتر جاتے ہیں اور کچھ مسلسل سفر میں ہیں۔ بس آہستہ آہستہ رینگ رہی ہے۔ کبھی تیز ہو جاتی ہے اور کبھی آہستہ۔ اترنے چڑھنے کا یہ سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے۔

"دھند اب کھڑکیوں اور روشندانوں سے رینگتی ہوئی پورے گھر میں پھیل رہی تھی۔ سب بے شناخت ہوا جارہا تھا۔(۱۲)"

بے اعتمادی اور بے یقینی کا عالم یہ ہے کہ رشتوں کی پہچان ختم ہو گئی ہے۔ حالات اس قدر پیچیدہ ہیں کہ ہر چیز بے شناخت ہو رہی ہے۔ ہر طرف دھند ہی دھند ہے۔ سماجی صورتحال نہایت تکلیف دہ ہے کہ انسان اپنی شناخت اور اپنوں کی شناخت کرنے سے قاصر ہے۔

"دھند گہری ہو جائے تو چیزوں کے درمیان ایک خاموش سمجھوتہ تو ہو ہی جاتا ہے۔(۱۳)"

کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ اس میں انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ کرنا چاہتا ہے لیکن بے بسی اس قدر ہوتی ہے کہ کچھ کرنے کی خواہش دل میں رکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پاتا۔ آخری حل حالات سے سمجھوتہ ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں۔

رشید امجد کے بیشتر افسانے ڈھلتے سورج اور شام کے منظر کو پیش کرتے ہیں۔ افسانہ "خواب راستہ" کا آغاز بھی شام کی ہلکی ہلکی تاریکی سے ہوتا ہے۔ جو آہستہ آہستہ رات میں بدل رہی ہے۔ افسانے کا بے نام کردار معمول کے مطابق آج بھی سر شام نکلتا ہے اور اپنے گھر کی طرف کھوئی کھوئی نظروں کے ساتھ سڑک پہ زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہے مختصر سا سفر شام سے رات میں بدل جاتا ہے اور وہ رات کے گہرے اندھیرے میں گھر کی چوکھٹ پر پہنچتا ہے۔ یہ شام سے رات کا طویل سفر اسے تھکا دیتا ہے روز کی طرح تھکے ہوئے وجود کے ساتھ وہ اندر داخل ہوتا ہے۔ گھر کا وہی منظر ہے بیوی نے میز پر کھانا رکھا ہوا ہے وہی خاموشی جو سڑک پہ سارے راستے میں تھی گھر کو بھی اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ وہ کھانا کھا کر اپنی بھوک کو مٹاتا ہے اور خاموشی سے اپنے بستر پر سونے کی ناکام کوشش کرتا ہے لیکن یادوں کی زنجیر اسے کہاں سے کہاں تک لے جاتی ہے۔ ذہن اسی تلاش میں ہے جو برسوں پہلے تھا۔ وہ سوچتا ہے۔

"افسوس آج بھی ان کا کچھ سراغ نہیں ملا وہ اپنے اپ سے کہتا ہے۔ جانے وہ اب کہاں ہے۔۔۔۔۔۔ شاید۔۔۔۔۔ جملہ پورا کرتے ہوئے خوف کی ٹھنڈی لہر پورے بدن میں دوڑ جاتی ہے۔

شاید۔۔۔۔۔(۱۴)"

وہ اپنی زندگی کے دو حادثوں کو سوچتا ہے۔ وہی دو حادثے اس کی زندگی کا مرکز بنے ہوئے ہیں جو برسوں پہلے ہوئے تھے۔ وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ خوابوں کی ایک نئی دنیا سجا رہا تھا لیکن اچانک اس کی گاڑی کے نیچے ایک کتا آگیا۔ کتے کی چیخ اور اس کا خون اس کی زندگی پر حاوی ہو گیا۔ اسے لگا کہ کتا گاڑی کے ٹائر کے نیچے نہیں آیا لیکن اس کے منہ سے تازہ گرم لہو کا فوارہ نکل کر سڑک پر پھیل رہا تھا۔ وہ وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر دوسرا حادثہ بھی اسی سڑک پر ہوا اس کی محبوبہ گاڑی سے نکل کر اسے کیلا چھوڑ گئی۔ وہ ایسے گئی جیسے اس کا کبھی کوئی وجود ہی نہ ہو۔ یہ دو حادثوں نے پوری زندگی کے لیے اس کے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ افسانے کا یہ بے نام کردار ان حادثات کو بھولنا چاہتا ہے لیکن نہیں بھول پاتا وہ چاہتا ہے کہ کاش کوئی اسے کہے کہ اس کی زندگی میں یہ سب ہوا ہی نہیں۔ کئی برس بیت گئے مگر وہ اپنی محبوبہ کو نہیں بھلا سکا۔ وہ مسلسل تلاش کے عالم میں زندگی گزار رہا ہے۔ پورے افسانے میں تلاش، خوف، پریشانی اور بے یقینی کی فضا پھیلی ہوئی ہے لیکن افسانے کے اختتام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب اس کردار کے وہمات و شبہات ہی ہیں۔ وہ مسلسل زندگی کے ساتھ الجھا ہوا ہے۔ وہ ہر وقت اپنی ذہنی کیفیت میں ہی الجھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ خود اعتمادی کی کمی یہ کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچنا نہیں چاہ رہا۔ مسلسل وہم کا شکار ہے۔

"خیال آتا ہے کہ معلوم نہیں یہ حادثہ ہوا بھی ہے یا نہیں شاید یہ اس کا وہم ہی ہو۔(۱۵)"

افسانے کے آخر میں پھر وہی راستہ پھر وہی خیالات پھر وہی خواب اس کا محور ہیں۔ آخر میں یہ بات ایک طرح سے واضح کرنے کی کوشش ہے کہ یہ سب اس کا وہم ہے۔ برسوں پہلے اس کے پاس گاڑی تو کیا سائیکل بھی نہیں تھی۔ آخر اس کی ذہنی کیفیت کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے آپ کو کبھی دلاسا دیتا ہے تو کبھی دوسروں سے پوچھتا ہے۔ پھر خود ہی کہتا ہے تمہیں تو پتہ ہی نہیں۔ تم نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ یعنی آخر تک وہ مسلسل وہم کا شکار رہتی ہے۔ ماضی اس کے سامنے بار بار آتا ہے۔ کوشش کے باوجود وہ برسوں پہلے ہونے والے حادثات بھول نہیں پاتا۔ مرکزی کردار کے ہاں پچھتاوا بھی پایا جاتا ہے۔ جب اس کی گاڑی کے نیچے کتا آتا ہے ہے وہ اس کی موت کے بعد کہتا ہے۔

"کسی اور کے سامنے آجاتا۔ میری گاڑی کے ہی سامنے کیوں آیا؟(۱۶)"

وہ چاہ رہا ہے کہ کسی اور کے آگے آتا تاکہ وہ اس کیفیت کا شکار نہ ہوتا اور نہ ہی وہ اس حادثے کی وجہ بنتا۔ رشید امجد نے اس افسانے میں انسانی نفسیات کی تہوں، یادداشت کی بھول بھلیوں اور ضمیر کی خلش کو فکری انداز میں پیش کیا ہے۔ اس میں موجود سادہ واقعات در اصل گہری علامتیں اور پیچیدہ جذباتی کیفیات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

افسانہ "دھند میں سے نکلتا ہوا دن" رشید امجد کے دوسرے افسانوں کی بہ نسبت علامتی ہونے کے ساتھ ساتھ داستانوی رنگ میں بھی لپٹا ہوا ہے۔ افسانہ "تلاش" سے ریزیمبلینس (Resamblance) رکھتا ہے۔ "تلاش" میں گوہر جان، محل، بادشاہ، ملکہ کا ذکر ہے۔ اسی طرح اس افسانہ میں بھی ملکہ، بادشاہ، کماندار اور سپاہی کے کردار پائے جاتے ہیں۔ شام کی نیم تاریکی کا وقت تھا اور ملکہ کے قافلہ نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا غاشیہ برادر نے رکنے کے بارے میں کچھ کہنا چاہا تو کماندار نے بتایا کہ ملکہ عالیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہم یہاں قیام کریں گے۔ غاشیہ برادر عماری سے مخملی فرش اٹھالایا۔ ملکہ کے لیے چوکی کو خالی کر دیا گیا تھا۔ وہ مخملی فرش سے چلتے ہوئے چوکی پر آئی اور اس نے ایک عجیب بے نیاز نگاہ ارد گرد ڈالی۔ سارے لوگ آرام کرنے چلے گئے مگر وہ وہی بت بنا کھڑا رہا۔ اگلی صبح جب ملکہ کا قافلہ چلا تو ملکہ نے اس کو ایک مرتبہ اپنی مخمور اور بے نیازی سے بھری آنکھوں سے دیکھا۔ مگر اب اس نگاہ میں کوئی لگاؤ کوئی پیغام تھا۔ خاموش پیغام یہی وہ لمحہ تھا جس نے اس کے اندر چلنے کی ہمت ڈال دی۔ کارواں جب فصیل شہر میں داخل ہوا تو مخملی شقہ کا پردہ ذرا سا کھلا اور حنائی انگلیوں سے معطر رومال اس کے قدموں آگرا اور کارواں فصیل شہر کے اندر گم ہو گیا۔

اس نے رومال کو اٹھایا اس میں موجود پیغام اس کے وجود میں اتر گیا۔ کچھ وقت کے بعد شاہی قیام گاہ میں اسے طلب کیا گیا۔ اس سے پوچھا گیا کہ وہ چوکی چھوڑ کر کیوں گیا۔ وہ کیا کہتا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا اسے تہہ خانے میں لے جایا گیا مگر اسے کوئی ہوش نہ تھا۔ یہاں تک کہ اسے اندر دھکا دیا گیا۔ اس دوران رومال اندھیرے میں نیچے گر گیا۔ صدیاں گزر گئی۔

"شام کی اس نیم تاریکی میں دور سے آتی ویگنوں اور جیپوں کی آواز ایک پر اسرار چاپ اور انجانی سی خوشبو۔(۱۷)"

اس جملے میں ماضی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ افسانے کا آغاز بھی اس طرح کے جملے سے ہوا ہے۔ شام کی نیم تاریکی میں گھوڑوں کی چاپ کی آواز اور حال میں شام کی نیم تاریکی میں کی میں جیپوں اور ویگنوں کی آواز ہے۔ رشید امجد یہاں حال میں ماضی کو relate کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ سر جھکائے رجسٹر پر اندراج چیک کر رہا تھا کہ نائب اس کو بلاتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ کیا بات ہے نائب جس کا نام دلاور خان ہے بتاتا ہے کہ ایک عورت آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ عورت جب سامنے آتی ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کی حالت کافی خراب ہے۔ پھٹے ہوئے لباس، ننگے پاؤں، ننھے بچے کو گود میں اٹھائے دروازے کے پٹ کا آسرا لیے کھڑی ہے اور التجا بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ مگر اس کی حالت ایسی تھی یوں لگتا کہ جیسے:

"صدیوں کے فاصلے نقطے میں سمٹ گئے ہیں۔(۱۸)"

اس عورت کی وہی مخمور آنکھیں مگر اب ان میں بے نیازی نہیں بلکہ درد ہے اور وہی مترنم آواز جس میں وہ کہتی ہے۔

" صاحب جی۔۔۔۔۔ مجھے آج رات یہاں رکنے دیں میرا بچہ ٹھیک نہیں۔ اس حالت میں اسے لے کر میں رات کو سفر نہیں کر سکتی۔ صاحب جی۔۔۔۔(۱۹)"

رشید امجد آخر میں پھر ماضی کے دریچے وار کرتے ہوئے اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ ملکہ نے اس رات اپنے شوہر سے وعدہ لیا تھا کہ قیدی کو معاف کر دیا جائے۔ بادشاہ نے بات مان لی اور کماندار کو حکم دیا تھا کہ قیدی کو چھوڑ دیا جائے۔ مگر فتح کے نشے میں سرشار کماندار شاہی فرمان بھول گیا۔ صدیاں بیت گئی کسی کو اس قیدی کا خیال نہ آیا کہ اس نے تاریکی، بھوک، پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کیسے جان دی۔ رشید امجد کے افسانوں میں شناخت اور پہچان ایک اہم موضوع ہے۔ جس میں وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوا۔ رشید امجد کے ہاں بے نام کردار اور بے شناخت آدمی بہت نمایاں ہیں۔ یہ دونوں معاشرے کی بے معنویت کی طرح اشارہ کرتے ہیں۔ رشید امجد اپنے افسانوں کی کہانی کے بارے میں کہتے ہیں کہ میری پوری کہانی ایک خیال کے گرد گھومتی ہے۔

اس افسانے میں رشید امجد نے وقت اور معاشرے کی تلخ حقیقت کی طرف واضح اشارہ کیا ہے کہ ہمیشہ وقت ایک سا نہیں رہتا۔ کہ کب وقت کا پہیہ گھومے اور وہ اپنے ساتھ کسی کی دولت اور شان و شوکت کو بہا کر لے جائے اور تنہا کر دے، پتہ ہی نہیں چلتا۔ مرکزی کردار حیران کھڑا حال اور ماضی کا مشاہدہ کر رہا ہے کہ کہاں ماضی میں اتنی دولت شان و شوکت طاقت کے نشے میں سرشار کسی بے گناہ کو قید میں ڈال کر بھول جانا۔ عورت کا ناز و نخرہ اور بے نیازی دکھانا مگر جب وقت کا پانسا پلٹا تو حال بے رحم ہو گیا۔ نہ شان و شوکت، نہ دولت، نہ طاقت، نہ ناز و نخرہ، نہ بے نیازی، نہ ہی کماندار اور نہ ہی سپاہی کچھ بھی اب اس کے پاس نہیں رہا۔ اب صرف التجا ہے اور سر چھپانے کو چھت کی ضرورت ہے۔ رشید امجد اس افسانے میں مسلسل حال اور ماضی کو دکھا رہے ہیں۔ اس افسانے کے ذریعے معاشرے کی حقیقت ہم پر واضح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ جب انسان کے پاس دولت ہوتی ہے تو وہ اپنے سے نچلے لوگوں کو کچھ نہیں سمجھتا۔ ان سے کراہت کھاتا ہے۔ ان کے ساتھ کھانا تو دور کی بات بیٹھنا پسند نہیں کرتا اور ان پر ظلم بھی کھلے دل سے کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بیچارے اتنے غریب ہوتے ہیں کہ وہ امیروں کے خلاف کچھ نہیں کر پاتے اور اگر کچھ کرنا بھی چاہیں تو قانون انصاف نہیں کرتا۔ وہ بھی امیروں کا ہی ساتھ دیتا ہے۔ کیونکہ ہمارے معاشرے میں امیروں کا راج چلتا ہے، ان کی قدر کی جاتی ہے، عزت دی جاتی ہے اس کے برعکس غریبوں کو دھتکارا جاتا ہے، ان کی بے عزتی کر کے امیر لوگ فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ افسانہ اعلیٰ حکومتوں کی طرف بھی ایک اشارہ ہے۔ حکومتوں کا بننے ٹوٹنے کا عمل تو جاری رہتا ہے کہ آج انسان اقتدار میں ہے تو ضروری نہیں کہ کل ہی اقتدار میں ہو۔

رشید امجد کی افسانہ نگاری ان کے دور کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کی کہانیاں معاشرتی، سیاسی اور عصری رجحانات کی ڈوریوں سے بنی ہوتی ہیں۔ انھوں نے ساٹھ کی دہائی میں کہانی لکھنے کا آغاز کیا، اس وقت مارشل لا کا دور تھا۔ یہ دور ان کی کہانیوں کا خمیر بنا۔ جیسے جیسے ان کے فن میں پختگی آئی، دوسرا مارشل لا شروع ہو گیا۔ پاکستان کو جبر اور آمریت کی فضا نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ایسے میں رشید امجد نے اس فضا کو اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا۔ یہی فضا ان کے افسانوں پر پوری طرح چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔

رشید امجد نے اپنے اسلوب کو ایک الگ طرز میں لکھا۔ ان کے افسانوں کے کردار نفسیاتی الجھنوں کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ازدواجی زندگی مضطرب دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنی اور رشتوں کی پہچان کھو دیتے ہیں۔ کچھ حال میں رہتے ہوئے بھی ماضی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے ہاں کردار کھل کر واضح طور پر اپنی کیفیت کو بیان نہیں کر سکتے۔

رشید امجد نے اپنے افسانوں میں زیادہ علامت نگاری کو استعمال کیا ہے۔ ان کے افسانے آپس میں بہت زیادہ Resamblance رکھتے ہیں۔ افسانہ "دھند" میں بس کا ذکر ہے تو افسانہ "تلاش" میں فلائنگ کوچ کا ذکر ہے۔ اسی طرح افسانہ "تلاش" اور "دھند میں سے نکلتا دن" میں شام کی نیم تاریکی اور گھوڑوں کی چاپ کا ذکر نظر آتا ہے۔ ان کے افسانے " وقت اندھا نہیں ہوتا"، "خواب راستہ"، "دھند میں سے نکلتا ہوا دن" اور "تلاش" ان سب میں کردار ہر وقت ماضی اور حال کا سفر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رشید امجد کے افسانے آپس میں بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ وہ کرداروں کے ذریعے اپنے دور کے حالات کو بیان کرتے ہیں کہ انسان کس طرح عدم حقیقت اور بے شناختی کا شکار ہو اجا رہا ہے۔

رشید امجد کے افسانوں میں روایت اور جدیدیت کی کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو کسی ایک زمانے میں مقید نہیں رکھتے۔ رشید امجد کے باطن میں پھیلی ہوئی ادبی، تازگی اور رنگارنگی ایک تیز خوشبو کی طرح ہر قسم کے موضوعات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

حوالہ جات

---

1) رشید امجد، ڈاکٹر، ست رنگے پرندے کے تعاقب میں"، راولپنڈی: حرف اکادمی، (۲۰۰۲ء)، ص۱۸

2) ایضاً۔ ص۱۸

3) ایضاً۔ص۱۹

4) ایضاً۔ص۲۸

5) ایضاً۔ص۳۶

6) ایضاً۔ص۴۱

7) ایضاً۔ص۴۵

8) ایضاً۔ص۵۱

9) ایضاً۔ص۵۱

10) ایضاً۔ص۵۳

11) طاہرہ اقبال، پاکستانی اردو افسانہ، لاہور: فکشن ہاؤس، (۲۰۱۵ء)، ص۲۴۳

12) رشید امجد، ڈاکٹر، ست رنگے پرندے کے تعاقب میں"، روالپنڈی: حرف اکادمی، (۲۰۰۲ء)، ص۵۶

13) ایضاً

14) ایضا۔ص۵۷

15) ایضاً۔ص۶۰

16) ایضاً۔ص۶۲

17) ایضاً۔ص۶۴

18) ایضاً۔ص۶۵

19) ایضاً